© rasailojaraid.com

سید محمد معاویہ بخاری

مستقبل کا سیاسی منظر نامہ......امریکہ کیا چاہتا ہے؟

آندھیاں بے سبب اُٹھتی ہیں اور نہ ہی حالات یک لخت بدلتے ہیں۔ تغیرات موسموں کے ہوں یا حالات کے دونوں کا ظہور و ورود طے شدہ فیصلوں کے تحت ہی ہوتا ہے۔ طوفانوں کی رفتار اور سمتوں کا تعین کرنے والے جدید ترین سسٹم بے شک پیشگی اطلاعات فراہم کرنے پر کسی حد تک ضرور قادر ہو گئے ہوں گے لیکن ان کی زد میں کون کس طرح آئے گا اور تباہی و بربادی کا میزانیہ کس عدد پر جا کر رکے گا یہ جاننے کی صلاحیت امریکہ سمیت ابھی تک کسی کو حاصل نہیں ہو سکی۔ اگر ایسا کسی درجہ میں بھی ممکن ہوتا تو امریکی افواج افغانستان، عراق پر کبھی حملہ آور نہ ہوتیں اگر انہیں یقین ہوتا کہ وہ تاریخ کے بدترین جانی و مالی نقصان اور ذلت و رسوائی سے دوچار ہونے جا رہے ہیں تو آتش و آہن برسانے کا منصوبہ صرف عیار شہہ دماغوں کی رائے تک ہی محدود ہو جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ارض و سما پر حکمرانی کا گھمنڈ، گہرے سمندروں پر تسلط اور خونریز حکمت عملیوں کی سو فیصد کامیابیوں کا زعم رکھنے والا ٹولہ اس طرح بے مراد ہوا ہے کہ بوکھلاہٹ میں اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ یہ واقعہ اپنی نوعیت میں بے مثال ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی عسکری قوت کے مدمقابل ایمان و عزم کی آہنی دیواریں یوں حائل ہوئی ہیں کہ وہ ان دیواروں کی سینکڑوں پرتیں نگل جانے کے باوجود یاجوج ماجوج کی طرح اپنی قہرمانی قوت سے معدوم نہیں کر سکی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ بہادر کو اب اپنے متبعین کی فہرست میں کھڑی فرنٹ لائن سٹیٹ کے ان چوکیداروں پر بھی اعتماد نہیں رہا اور وہ اپنی شکست کے اسباب کا موازنہ کرتے ہوئے اس کے کردار کو بھی اپنی ہزیمت کی بنیادی وجہ قرار دے رہا ہے۔ گزشتہ 6 برسوں کے دوران DO MORE کے چابک سے دشوار گزار اور بے سمت راستوں میں ہانکنے کے باوجود اسے فرنٹ لائن سٹیٹ کے نگہداروں کی نیتوں پر شک ہے اور وہ ان کے حلف وفاداری کو جانچنے، پرکھنے کے لئے نت نئی ترکیبیں آزمانے پر تلا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ امریکہ پاکستان سے کیا چاہتا ہے؟ یہ سوال اس لئے بھی زیادہ اہم ہے کہ گزشتہ آٹھ برسوں کے دوران امریکی عہدیداروں نے پاکستان کو جتنی بار شرف میزبانی بخشا ہے اس کی مثال ہماری ساٹھ سالہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ آخر اس التفات بے اماں کے تقاضے کیا ہیں؟ یہ بات اپنی جگہ قابل غور ہے کہ ایک ہی خطہ میں واقع دو اہم حلیف ممالک بھارت اور پاکستان کے حوالہ سے اس کی ترجیحات کا دائرہ مختلف کیوں ہو جاتا ہے؟ بقول سیکرٹری خارجہ ''کنڈولیزا رائس'' کے پاکستان صرف وار اون ٹیرر میں حلیف بنائی گئی فرنٹ لائن سٹیٹ ہے اور بھارت امریکہ کا مستقل سٹریٹیجک پارٹنر ہے۔ کیا ہماری بقا کا دارومدار بلا چون و چرا تابعداری سے مشروط بنا دیا گیا ہے۔ اور بصورت دیگر خاکم بدھن پاکستان کے وجود پر بھی سوالیہ نشان لگ سکتے ہیں؟ کیا ہمارے حکمران اس بات سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ ان کی موجودہ پالیسیاں ملکی سلامتی کے حوالہ سے کہاں کھڑی ہیں۔ اور ان پالیسیوں کے خلاف قومی ردِعمل کا گراف کس خطرناک حد کو چھو رہا ہے؟۔ بے حیثیت اپوزیشن کی بے اثر ہاؤ ہو ایک طرف لیکن چیف جسٹس کے خلاف دائر شدہ صدارتی ریفرنس کے معاملے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر وکلاء برادری اور سول سوسائٹی کا احتجاج ظاہر کر رہا ہے کہ حکمرانوں کی نا قابل فہم حکمت عملی اور غیر مرئی قومی مفادات کے تحفظ کا دعویٰ مطلقاً باطل ہے اور حکمران قوم کو یہ باور کرانے میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں کہ ان کے عہد میں ملکی سلامت اندوہناک خدشات کی زد سے باہر نکل آئی ہے اور ان کے اقتدار کی طوالت ہی ملک وقوم کو عزت وعظمت اور ترقی وفلاح کے عروج تک پہنچا سکتی ہے۔ قومی سطح کے اس عدم اعتماد نے ہی امریکی انتظامیہ کے لئے بھی تشویش پیدا کی ہے، وہ کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ صدر جنرل پرویز مشرف گزشتہ آٹھ برسوں سے قائم اپنی کمانڈنگ پوزیشن میں نہ صرف کمزور ہوئے ہیں بلکہ پہلی بار خود کو ایک مشکل صورت حال میں گھرا ہوا بھی دیکھ رہے ہیں۔ ۹/مارچ سے پہلے انہوں نے کبھی دفاعی پوزیشن اختیار کی تھی اور نہ ہی اپنی حلیف حکمران جماعت سے گلہ کرتے ہوئے انہیں یہ کہنا پڑا تھا کہ ''اتنی بڑی وزارتی کابینہ بھی میری پالیسیوں کا عوامی سطح پر دفاع کرنے میں ناکام رہی ہے'' بقول صدر پرویز مشرف کہ حالات کے گرداب میں مجھے تنہا چھوڑ دیا گیا ہے، اگر سب کچھ مجھے ہی کرنا ہے تو پھر ان لوگوں کی کیا ضرورت ہے۔ مذکورہ بالا جملے صدر پرویز مشرف نے بھاری بھرکم وفاقی کیبنٹ کے ایک اہم اجلاس میں کہے تھے۔ اور ان کے لب ولہجے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ موجودہ صورتحال میں وہ خود کو کہاں کھڑا دیکھتے ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے صدر صاحب عوامی اجتماعات میں حکمران جماعت کے سرکردہ افراد کو اپنی حمایت یافتہ معتبر ٹیم قرار دے کر عوام سے اپیلیں کر رہے تھے کہ وہ آئندہ انتخابات میں انہیں ووٹ دے کر دوبارہ منتخب کرائیں تاہم اب محسوس ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ شاید موقوف ہو چکا ہے اور مستقبل کے لئے نئی صف بندی کے لئے سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے۔ صدر صاحب کے پیش نظر ان کے دوبارہ منتخب ہونے کا مرحلہ درپیش ہے۔ اور صورتحال یہ ہے کہ اس حوالہ سے انہیں خود اپنی حلیف جماعت کے سرکردہ افراد سید کبیر علی واسطی، مشاہد حسین سید، ایس ایم ظفر سمیت دیگر کئی اہم رہنماؤں کی مخالفت کا بھی سامنا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ حکمران جماعت پرویز مشرف صاحب کے باوردی صدر رہنے کے معاملہ پر تقسیم ہو چکی ہے۔ میر ظفر اللہ خان جمالی، سید کبیر علی واسطی، مشاہد حسین سید اور ایس ایم ظفر جیسے اعلیٰ پارٹی عہدیدار اپنے متعدد انٹرویوز میں برملا کہہ چکے ہیں کہ وہ جنرل پرویز مشرف کے باوردی صدر رہنے کو آئین کے خلاف اقدام تصور کرتے ہیں۔ بقول مشاہد حسین سید کے کہ وہ جنرل پرویز مشرف کے بجائے مسٹر پرویز مشرف کو صدر بنانے کے حق میں ہیں۔ اور ان کا آئندہ صدارتی انتخاب اگلی منتخب اسمبلیوں سے ہونا ہی درست اقدام ہوگا۔ مذکورہ صورتحال اتنی واضح ہے کہ اسے مخفی نہیں رکھا جا سکتا اور یقیناً امریکی حکام بھی اس پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امریکی انتظامیہ کو جنرل پرویز مشرف کے آئندہ کئی برسوں تک ضرورت رہے گی اور اس کا اظہار بہت پہلے کیا جا چکا ہے۔ البتہ اس ضرورت کو پاکستان کے موجودہ حالات کے تناظر میں نئی ترتیب ومنصوبہ بندی کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ذرائع ابلاغ کی رپورٹوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر حالات وواقعات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دو ہفتے قبل اسلام آباد میں امریکی عہدیداروں پر مشتمل ''دب اکبر'' کا ظہور محض اتفاق نہیں تھا۔ ماہر سیاسی نجومیوں کی متفقہ رائے ہے کہ ایسا انوکھا قران آفات کے نزول اور نحوست حالات کے جلد ظاہر ہونے کی علامت ہوتا ہے اور اس طرح کے نظارے ہمیشہ اس وقت ہی دکھائی دیتے ہیں جب گردش ایام کسی تکوینی فیصلے کے تحت انہیں دھکیلتے ہوئے کسی خاص منظر نامے کی تشکیل کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لئے یکجا کر دیتی ہے۔ ذرائع ابلاغ پر پیش کئے جانے والے تجزیوں، تبصروں میں بھی اسی غیر مرئی حقیقت کا اعتراف کیا جارہا ہے کہ آنے والے دنوں میں بہت کچھ ایسا ہونے جارہا ہے جس کی توقع آج سے چار ماہ قبل نہیں کی جارہی تھی۔ وہ کونسے بڑے فیصلے ہیں جن کے لئے فضا ہموار کئے جانے کی منصوبہ بندی ہورہی ہے؟ سیاسی وسماجی حلقوں میں اس وقت یہی موضوع زیر بحث ہے۔ نائب وزیر خارجہ برائے جنوبی ایشیا ''رچرڈ باؤچر'' نائب وزیر خارجہ اوّل ''جان نیگرو پونٹے'' اور سنٹرل کمانڈ کے سربراہ ''کمانڈر ولیم جے فالن'' کی پاکستان آمد اور پھر حکومتی عہدیداروں کے علاوہ اپوزیشن رہنماؤں، چیف الیکشن کمشنر سے ان کی ملاقاتیں یقیناً غیر معمولی نوعیت کی حامل تھیں، ان کے پاس موجودہ حکومت اور اپوزیشن جماعتوں کے مابین اختلافات ختم کرانے کے کی مصالحتی تجاویز کے بجائے ان حتمی فیصلوں کی فہرست تھی جس کے مطابق مستقبل کے سیاسی سیٹ اپ کو چلانا مقصود ہے۔ تجزیہ نگاروں کے مطابق تینوں امریکی عہدیدار پاکستان کے اندرونی حالات کے پیش نظر کثیر الجہتی ایجنڈا لے کر آئے تھے۔ رچرڈ باؤچر کیونکہ جنوبی ایشیاء کے امور سے متعلق شعبہ کے نگران ہیں۔ پاک بھارت تعلقات، کشمیر، ایران، پاکستان، بھارت گیس پائپ لائن منصوبہ اور چین و ایران سمیت خطے کے دیگر کئی اہم سیاسی و اقتصادی معاملات ان کے ایجنڈے میں شامل تھے۔ چنانچہ ان کے پاس خطے کی مجموعی صورتحال اور پڑوسی ممالک کے ساتھ سیاسی، تجارتی، سفارتی اور اسٹرٹیجک تعلقات کے حوالہ سے امریکی ترجیحات کا پلندہ تھا۔ رچرڈ باؤچر نے چیف الیکشن کمشنر آف پاکستان سے ملاقات کرنے کے علاوہ بلوچستان کا دورہ بھی کیا اور بلوچستان کی تازہ ترین صورت حال پر نہ صرف پاکستان میں موجود اپنے خاص کارندوں بلکہ صوبائی حکومت سے بریفنگ بھی حاصل کی۔ جبکہ پاکستان آمد سے قبل انہوں نے دبئی میں پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بے نظیر بھٹو سے ملاقات بھی کی تھی۔ ذرائع کے مطابق ملاقات کے دوران صدر پرویز مشرف کے ساتھ کسی ممکنہ مفاہمت اور سیاسی سیٹ اپ میں ان کے کردار کا تعین کرنے کے ضمن میں بھی تفصیلی بات ہوئی ہے۔ جبکہ ''جان نیگرو پونٹے'' جنہیں حکومتوں کی مجموعی کارکردگی ناپنے اور پھر انہیں امریکی مفادات کے ساتھ منسلک کر کے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کا ۳۰ سالہ تجربہ حاصل ہے۔ ان کی خدمات اس وقت حاصل کی جاتی ہیں جب کسی بڑے فیصلے کی جانب پیش رفت کرنا مقصود ہو اور کہا یہی جارہا ہے کہ موجودہ صورتحال کے تناظر میں وہ صدر مشرف کے لئے امریکی حکومت کی نئی ہدایات لے کر آئے تھے۔ اور امکان یہی ہے کہ نیگرو پونٹے نے پاکستان کے عام انتخابات، صدر مشرف کے وردی سمیت یا بغیر وردی کے اقتدار میں رہنے کے بارے میں تفصیلی بات چیت کی ہے۔ مبصرین کے بقول صدر مشرف کو بتا دیا گیا ہے کہ اب ان کی وردی کے حوالہ سے خود امریکی حکومت پر بھی دباؤ بڑھ رہا ہے، اور اسی وردی کو بنیاد بنا کر امریکی کانگریس، تھنک ٹینکس اور امریکی میڈیا کی جانب سے پاکستان کو دی گئی مراعات پر بھی نہ صرف تنقید کی جارہی ہے بلکہ صدر بش سے مطالبہ کیا جارہا ہے کہ وہ جنرل پرویز مشرف کے مستقبل کے ساتھ ساتھ ان کے نعم البدل پر بھی سنجیدگی کے ساتھ غور وخوض کریں۔ چنانچہ جان نیگرو پونٹے کے ذریعہ حکومتی سطح پر متنبہ کر دیا گیا ہے کہ اب صدر مشرف کو سوبار وردی میں منتخب کرانے کے نعروں اور دعوؤں سے اجتناب کیا جائے۔ سنٹرل کمانڈ کے سربراہ کمانڈر ولیم جے فالن کو افغانستان میں طالبان کی بڑھتی ہوئی مزاحمت اور پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ان کے نفوذ ورسوخ کے حوالہ سے امریکی حکمت عملی کی تفصیلات بتانے کے لئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھیجا گیا تھا۔ تجزیہ نگاروں کے بقول دنیا بھر میں بے اعتبار ہوتی رسوائے زمانہ ''دہشت گری کے خلاف جنگ'' (War on Terror) کی حیثیت اب نوگیارہ ۲۰۰۱ء کے فوری بعد پیدا شدہ کیفیت سے بالکل مختلف ہو چکی ہے، عراق وافغانستان میں بگڑتے حالات، مزاحمت پسندوں کی بڑھتی ہوئی گوریلا کارروائیاں، امریکہ اور اس کی اتحادی افواج کے بھاری جانی و مالی نقصانات اور سب سے بڑھ کر ہیبت ناک سپر طاقت کا ڈولتا دبدبہ ایسے حقائق ہیں جنہیں امریکی حکومت کیلئے نظر انداز کر دینا ممکن نہیں ہے۔ جبکہ ''وار اون ٹیرر'' کے غیر فطری حلیف پاکستان کے لئے مشکلات اس لئے بھی زیادہ ہیں کہ اس جنگ میں جو کردار اسے سونپا گیا تھا وہ ملک کی اسٹریٹیجک حیثیت واہمیت اور صدر جنرل پرویز مشرف کی عسکری قیادت کو مدنظر رکھتے ہوئے سونپا گیا تھا۔ امریکی حکام ماضی کے تجربات کے پیش نظر بخوبی آگاہ تھے پاکستان میں کوئی بھی منتخب سیاسی حکومت اس کے خونریز ایجنڈے کی تکمیل کے لئے نہ تو حامی بھر سکتی ہے اور نہ ہی وہ مطلوبہ طاقت ور کردار ادا کر سکتی ہے۔ جس کی توقع ایک باوردی فوجی سربراہ سے کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ صدر پرویز مشرف امریکی انتظامیہ کی نظر میں آخری اور حتمی انتخاب ہیں۔ اور مستقبل قریب میں پیش آنے والے مشکل حالات کے لئے ان کے پاس کوئی دوسرا نعم البدل موجود نہیں ہوگا۔ ایسا سوچنا درست نہیں ہے۔ ہمیں ایک بات ضروری جان لینی چاہئے کہ امریکی پالیسیاں خواہ قلیل المدتی ہوں یا طویل المیعاد دونوں صورتوں میں صرف امریکی مفادات کو ہی مدنظر رکھا جاتا ہے اور اس طے شدہ طریق کار کے مطابق کسی حلیف حکمران کی اہمیت وضرورت مستقل بنیادوں پر نہیں سمجھی جاتی۔ ایسا تو ضرور ہوا ہے اور ہو رہا ہے کہ حسنی مبارک اور حامد کرزئی جیسے کٹھ پتلی حکمرانوں کی مدت اقتدار میں حالات کی نوعیت کے پیش نظر اضافہ قبول کر لیا جائے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ صورت حال کی نزاکت، اور اپنے مفادات کے یقینی تحفظ کے لئے چہروں کی تبدیلی کے لئے بھی امریکی پالیسی ساز ادارے اپنے منصوبوں میں پوری گنجائش باقی رکھتے ہیں۔ سیاسی اتار چڑھاؤ پر گہری نظر رکھی جاتی ہے قریب الفکر جماعتوں سے مراسم مضبوط بنائے جاتے ہیں اور جہاں مخالف فکر کے لوگوں کے طاقتور ہونے کا امکان پیدا ہوتا ہے تو انہیں کمزور بنانے کے لئے اپنے حلیف طبقات کی بھرپور انداز میں مدد بھی کی جاتی ہے۔ اس امداد کا ایک حصہ عالمی ذرائع ابلاغ بھی ہیں جو اس ضمن میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ منظور نظر گروہ کو برسرِ اقتدار لانے کے لئے رائے عامہ کو ہموار کرنے کی مہم شروع ہو جاتی ہے اسی طرح اگر کسی حکومتی سیٹ اپ کی جڑیں کھوکھلی کرنا مقصود ہوں تو یہی ذرائع ابلاغ اس کے خلاف پروپیگنڈا کر کے حکومتی ساکھ کو دنیا بھر میں نامعتبر بنا دیتے ہیں۔ جنرل ایوب خان سے جنرل مشرف تک کے ادوار میں امریکی پالیسیاں اسی مہم نہج پر استوار چلی آ رہی ہیں۔ اور اب بھی غالب گمان یہی ہے کہ جس طرح ماضی قریب وبعید میں مختلف عنوانات کی تشہیر کر کے مخالف قوتوں کا راستہ روکنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے اسی طرح انتہا پسندی اور اعتدال پسندی کے نئے اختراع شدہ عنوان کو بنیاد بنا کر میڈیا مہم کے ذریعے ایسی جماعتوں کا راستہ روکنے کی پالیسی ضرور اختیار کی جائے گی جو افغانستان کی صورتحال اور قبائلی علاقوں میں رونما ہونے والے واقعات پر اپنے تحفظات کا برملا اظہار کر رہی ہیں۔ معتبر ذرائع تسلیم کرتے ہیں کہ ایک ایسا سیاسی سیٹ اپ بنانے کا فیصلہ ہو چکا ہے جس میں مذہبی جماعتوں کا کردار کلی طور پر منفی کر دیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com